پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

پالیسی بیان

مئی 2021

خوف اور سنسرشپ کا خاتمہ
اظہار رائے کی آزادی کا تحفظ اور صحافیوں کی سلامتی

تعارف

ریاست اور غیرریاستی عناصر معلومات پر اپنی گرفت مضبوط کررہے ہیں اور یہ بات واضح ہے کہ ترجیحی بیانیے کو چیلنج کرنے والوں کو سزا دی جائے گی۔ اختلاف رائے پاکستان میں جرم بن چکا ہے۔ صحافیوں کی ساکھ کو نقصان پہنچانے کے لئے ان پر 'غدار' یا 'ریاست مخالف' کا لیبل لگا دیا جاتا ہے۔

ان خیالات کاا ظہار شرکاء، جن میں براڈکاسٹ، پرنٹ اور ڈیجیٹل میڈیا سے تعلق رکھنے والے رپورٹر، پروڈیوسر اور ایڈیٹرشامل تھے، نے پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کی جانب سے نومبر 2020 میں ملک بھر میں منعقد کی گئیں فوکس گروپ ڈسکشنز (ایف جی ڈی)کے موقع پر کیا۔اس بحث کا مقصد یہ تھا کہ میڈیا کے افراد اپنے پیشے کو لاحق خطرات کا جائزہ لے سکیں اور پاکستان میں اظہار رائے کی آزادی کے بارے میں آگہی بڑھانے کے لئے ایک لائحہ عمل پر اتفاق کرسکیں۔

اس با ت پر اتفاق کیا گیا کہ کسی قسم کے تحریری ضوابط کی غیر موجودگی میں، سنسرشپ ایک مبہم تصور ہے جہاں ماخذ کی نشاندہی نہیں ہوسکتی۔ احکامات فوج، سیاسی حکومت یا پھر پاکستان الیکٹرانک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی (پیمرا)یامیڈیا کے اداروں کے ان منتظمین کی جانب سے بلاواسطہ یا بالواسطہ ہوسکتے ہیں جو اکثر اس بات کا حوالہ دیتے ہیں کہ میڈیا کی تباہ حال معیشت اور سکڑتی ہوئی اشتہاری آمدن کو سیاسی بحث کی گنجائش کو محدود کرنے کے آلے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

خطرات دھمکی، ملازمتی عدم تحفظ نیز جسمانی حملوں اور گمشدگیوں کی شکل میں ہوسکتے ہیں۔ انٹرنیشنل فیڈریشن آف جرنلسٹس (آئی ایف جے) نے 'عالمی صحافت سے متعلق وائٹ پیپر' میں پاکستان کو 'دنیا میں صحافت کے لئے خطرناک ترین ممالک میں سے ایک' قرار دیا ہے۔ اس کی اطلاعات کے مطابق فرائض کی انجام دہی کے دوران 138 صحافی اپنی زندگیوں سے محروم ہوگئے۔

ان جرائم کا بلا خوف ارتکاب کیا جاتا ہے اور یہ میڈیا کی آزادی پر خوفناک اثرات مرتب کررہے ہیں۔ مسلسل نگرانی، حفاظتی قوانین کی کمی اور الیکٹرانک جرائم کی روک تھام کا ایکٹ (پیکا) کا غلط استعمال صحافیوں کو خود پر سنسر شپ عائد کرنے پر مجبور کررہا ہے۔ بلوچستان اور خیبرپختونخوا کے شورش زدہ علاقوں میں صحافی حقائق کی تحقیقات اور رپورٹنگ کے حوالے سے خوف کا شکارہوگئے ہیں۔

مزید برآں، مذہبی انتہا پسندوں کی جانب سے دھمکیاں صحافیوں کو مذہبی آزادی اور حقوق پر رپورٹنگ سے روک رہی ہیں۔

صحافت سے وابستہ ہر شخص جانتا ہوگا کہ ملک کے زیادہ تر نیوز رومز پرمردوں کا غلبہ ہے۔ خواتین تعداد میں بہت کم ہیں اور انہیں غیر اہم معاملات پر رپورٹنگ کا موقع دیا جاتا ہے۔ فیلڈ اور دفتر میں کام کرنے والے خواتین صحافیوں کو ہراسگی کا سامنا رہتا ہے۔ انہیں غیرمطلوب پیش قدمیوں سے لے کر پرتشدد دھمکیوں تک کسی بھی چیز کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

پاکستان کی تقریباً 70 فیصد آبادی دیہی علاقوں میں رہتی ہےجہاں مفاد عامہ اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی داستانیں عام ہیں۔ اس کے باوجود، میڈیا ہاؤسز کا جھکاؤ شہری علاقوں کی کوریج کی جانب ہوتا ہے اور وہ دیہی علاقوں میں خبروں کے بنیادی ڈھانچے کی تشکیل میں دلچسپی نہیں لیتے۔ نتیجتاً، وہ ان فری لانس معاونین اور نمائندوں پر انحصار کرتے ہیں جنہیں خدمات کا مناسب معاوضہ نہیں دیا جاتا۔تربیت اور میڈیا سے متعلق اچھی مہارتوں اور سرگرمیوں کو فروغ دینے والے ماحول کی تشکیل میں سرمایہ کاری انتہائی کم ہے۔ اور، اس سے متاثر صحافت ہی ہوتی ہے جو ملک مین تیزی سے زوال کی جانب گامزن ہے۔

اس وقت ایک مضبوط قانونی ڈھانچے کی تائید نیز میڈیا کے افراد کے لئے مؤثر ریاستی تحفظ کی ضرورت ہے۔ انسانی حقوق کے عالمی اعلامیے (یو ڈی ایچ آر) کی دفعہ 19بلا امتیاز اظہار رائے کی آزادی کا تحفظ کرتی ہے۔ ایچ آر سی پی کا ماننا ہے کہ میڈیا کے افراد کے لئے موجودہ ماحول اس بنیادی حق کے منافی ہے۔

نیچے اسلام آباد، کراچی، لاہور، کوئٹہ، پشاور اور ملتان میں منعقد ہونے والی فوکس گروپ ڈِسکشنز سےلئے گئے اقتسابات بیان کئے گئے ہیں۔

ریاست، میڈیا مالکان، اور مشتہرین کی جانب سے سنسرشپ اور خود پر عائد کردہ سنسرشپ

تمام شرکاء نے خوف اور سنسرشپ کے بارے میں کھل کر بات کی۔ اسلام آباد میں ہونے والی ایف جی ڈی میں شرکاء نےسنسر شپ کی حالیہ مثالوں میں پیمرا کی جانب سے نواز شریف اور آصف علی زرداری کی پانچ تقاریر روکے جانے کا حوالہ دیا۔ایک سینیئر صحافی نے کہا کہ "پیمرا ایک آزاد ادارہ تصور کیا جاتا ہے لیکن اس پر وفاقی حکومت کا کنٹرول ہے۔"

مزید برآں، میڈیا کے افراد کی جبری گمشدگی کے واقعات کے باعث وہ خود کو غیر محفوظ محسوس کرتے ہیں۔ سینیئر صحافی مطیع اللہ جان کے اغواء اور جیو نیوز کے صحافی علی عمران سید کی گمشدگی نے ملک بھر کے صحافیوں کو خوفزدہ کردیا ہے۔ چنانچہ، وہ حقائق پر مبنی رپورٹس مرتب کرنے سے اجتناب کرتے ہیں۔ اسد علی طور کا کیس اس کی حالیہ مثال ہے۔

اسد علی طور کا کیس

12 ستمبر 2020 کو نصیر آباد کے رہائشی حافظ احتشام نے راولپنڈی کے تھانہ جاتلی میں اسلام آباد سے تعلق رکھنے والے صحافی اسد علی طور کے خلاف ایک درخواست دائر کی جس پر ان کے خلاف ٹویٹر پر پاکستان کے اداروں اور فوج کے خلاف پراپیگنڈا کو فروغ دینے پرضابطہ تعزیرات پاکستان سیکشن 499(ہتک عزت)، 500(ہتک عزت پر سزا) اور 505(عوامی اشتعال کا باعث بننے والے بیانات)اور الیکٹرانک جرائم کی روک تھام کا ایکٹ 2016 کے سیکشن 11، 20 اور 37 کے تحت مقدمہ درج کرلیا گیا۔

20 دنوں کے عرصے کے دوران چار عدالتوں میں ہونے والی 16 سماعتوں کے بعد ایف آئی آر کو بے بنیاد قرار دیا گیا۔

اب تک نہ تو پولیس اور نہ ہی ایف آئی اے نے ان قابل اعتراض ٹویٹس کی نشاندہی کی ہے جن کی بنیاد پر مقدمہ درج کیا گیا تھا۔

بلوچستان میں صحافیوں کو تقریر کی آزادی کے حوالے سے شدید زوال کا سامنا ہے۔ مختلف حلقوں، بالخصوص کالعدم بلوچ علیحدگی پسند تنظیموں اور حکومتی حمایت یافتہ ملیشیازکی جانب سے ان کی کڑی نگرانی انہیں تربیتی سیشنز، آگہی کی مہمات یا پریس کانفرنسوں پربھی رپورٹ یا تبصرہ کرنے سے پہلے کئی مرتبہ سوچنے پر مجبور کردیتی ہے۔ انہیں جبری گمشدگیوں، ایران کے ساتھ تفتان سرحد اور افغانستان کے ساتھ چمن سرحد کی بندش کی کوریج سے بھی گریز کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ اپنے ذرائع یا نیوز میکرز کو دھمکیوں اور پوچھ گچھ کے خطرے سے محفوظ رکھ سکیں۔ خضدار کے تعلق رکھنے والے ایک شریک نے بتایا کہ لیڈی ہیلتھ ورکرز کے لئے ماں اور بچے کی صحت کے موضوع پر ہونے والے ایک تربیتی سیشن میں انٹیلی جنس ایجنسی کے ایک

اہلکار نے شرکاء سے تربیت اور بحث کی نوعیت کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ اس کا کہنا ہے کہ "وہ ہر شہری کے لئے خوف پیدا کرنا چاہتے ہیں۔"

اسی طرح، خیبرپختونخوا میں کام کرنے والے صحافیوں نے تجربے سے سیکھا ہے کہ ان کی اپنی سلامتی کے لئے خود پر سنسرشپ عائد کرنا ضروری ہے۔ ان کے لئے سٹوری میں ہر ایک کا موقف شامل کرنا مشکل ہوتاجارہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ لاپتا افراد سے متعلق رپورٹس صرف اس وقت نشر کی جاتی ہیں جب حکومت یا آئی ایس پی آر اس حوالے سے کوئی بیان جاری کرے۔

ٹی وی ریٹنگ کے نظام کو بھی سنسرشپ کے آلے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ چینلوں اور اینکروں کو زیر دباؤ رکھنے کے لئے اس کا ناجائز استعمال کیا جاتا ہے۔ اسلام آباد میں میڈیا کے افراد نے بتایا کہ حزب اختلاف کے رہنماؤں سے متعلق پروگراموں کو منفی جبکہ اسٹیبلشمنٹ اور حکومتی اداروں کے حق میں پروگراموں کو مثبت ریٹنگ ملتی ہے۔ سیاست میں اسٹیبلشمنٹ کے کردار اور پی ٹی آئی حکومت کے نظم و نسق کے مسائل پر تنقید کرنے والے اینکروں کو کم ریٹنگ ملتی ہے اور بعدازاں انہیں ملازمت سے فارغ کردیا جاتا ہے۔

تاہم، ریاستی سنسر شپ پاکستان میں میڈیا کی آزادی کو محدود کرنے کا واحد طریقہ نہیں ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ میڈیا ہاؤسز اور ریاست کے مفادات کم و بیش ایک جیسے ہیں۔

> "مالکان کے اپنے مفادات ہوتے ہیں۔ جب وہ خود کالجوں کی سب سے بڑی چین چلا رہے ہوں گے تو وہ کبھی بھی تعلیمی اداروں کے بارے میں تحقیقی رپورٹ کی اجازت نہیں دیں گے۔"

اس سے نیوز رومز میں موجودأن سینیئرز کی جانب سے سخت جانچ پڑتال، پریشان کن پوچھ گچھ اور سخت گیر لہجے کا کلچر فروغ پارہا ہے جن کا زیادہ تر دائیں بازو کے نظریات کی جانب جھکاؤ ہوتا ہے یا پھر وہ مخصوص حلقوں کو خوش کرکے مراعات حاصل کرتے ہیں۔

> "پریس کی آزادی کا تعلق سول- ملٹری عدم توازن سے ہے۔اظہار رائے کی آزادی کا تحفظ سیاسی رہنماؤں کی ذمہ داری ہے جس کی ضمانت پاکستان کے آئین کی دفعہ 19 میں دی گئی ہے۔"

عام خیال یہ ہے کہ پاکستا ن میں ڈیجیٹل میڈیا ایک نسبتاً آزادانہ موقف کا اظہار کرنے کے قابل ہے کیونکہ اسے حکومتی اشتہارات کا سہارا نہیں لینا پڑتا۔ اس کے باوجود، لاہور میں فوکس گروپ ڈِسکشن میں شرکت کرنے والے میڈیا کے افراد کا خیال ہے کہ اختلاف رائے اور ممنوعہ موضوعات کی کوریج کی گنجائش کم ہورہی ہے۔

> "ہمیں الفاظ استعمال کرتے وقت خاص احتیاط کرنا پڑتی ہے، خاص طور پر ولاگز اور لائیو سٹریمنگ میں۔ پاکستان ٹیلی کمیونی کیشن اتھارٹی کی مداخلت بہت زیادہ ہے۔ چینل بند کرنے کے لئے ایک کال ہی کافی ہوتی ہے۔ ہمارا چینل دو مرتبہ بند ہوچکا ہے۔"

مذہبی حلقوں اور جماعتوں کی طرف سے دباؤ بھی بڑھ رہا ہے۔ دھمکی کسی مذہبی جتھے یا پھر ایک خاص مذہبی یا فرقہ ورانہ جھکاؤ رکھنے والے ہم پیشہ ساتھیوں کی طرف سے آسکتی ہے۔ اس سے اکثر خود پر سنسرشپ عائد کرنے کا جواز ملتا ہے۔

> "ایک دفعہ ہم نے بریلوی رہنما خادم حسین رضوی کی نامعقول حرکات پر ایک طنزو مزاح ریکارڈ کیا۔ ہم آن لائن ہونے کے لئے تیار ہی تھے جب میرا ساتھی یہ کہتے ہوئے پروگرام سے دستبردار ہوگیا کہ اسے اپنےخاندان کے بریلوی افراد کی طرف سے سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کا تعلق دیوبندی مکتبہ فکر سے تھا۔"

سفارشات

- میڈیا کے افراد کو غیرجانبداری سے کام کرنے کی اجازت دی جائے۔ حکومت اور ریاستی اداروں کو احساس دلایا جائے کہ صحافت جرم نہیں۔
- صحافیوں کو جان سے مارنے کی دھمکیوں کی مکمل تحقیقات کی جائے۔
- پیمرا کو ایک آزاد ادارے کے طور پر کام کرنا چاہئے نہ کہ حکومتی معاون کے طور پر
- پیکا قوانین ختم کئے جائیں

- جرنلسٹ پروٹیکشن بل 2020 کا نفاذ کیا جائے
- بلوچستان اور خیبرپختونخوا میں آزاد اور طاقت ور میڈیا کی فضاء قائم کی جائے
- بلوچستان اور خیبرپختونخوا میں مالکان اور ریاستی اداروں کو میڈیا کے افراد کا تحفظ کرنا چاہئے
- ٹی وی ریٹنگ کے نظام کو جدید خطوط پر استوار کیا جائے
- میڈیا کے ادارے ایسے غیرجانبدار افراد چلائیں جن کا کوئی ذاتی ایجنڈا نہ ہو

شورش زدہ علاقوں میں صحافیوں کا تحفظ

"بلوچستان میں میڈیا تو ہے لیکن میڈیا کی آزادی نہیں۔"

یہ بات باآسانی کہی جاسکتی ہے کہ صحافت کے لئے بلوچستان پاکستان کا مشکل ترین علاقہ ہے۔ اسے معلومات کے لحاظ سے ایک 'سیاہ گڑھا' کہا جاتا ہے جہاں ریاست اور غیر ریاستی عناصر کے درمیان طویل عرصے سے جاری جنگ نے آزادانہ معلومات تک رسائی کا حصول انتہائی مشکل بنا دیا ہے۔ مختلف ضلعی سطح کے پریس کلبوں کی نمائندگی کرنے والے شرکاء نے اتفاق کیا کہ حکام نہیں چاہتے کہ کوئی بھی صوبے کے بارے میں کچھ بھی جانے۔

نتیجتاً، بلوچستان کے عوام کی مشکلات، جن میں سے زیادہ تر کا تعلق انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے ہے، بہت بڑا راز ہیں۔ ایسے صحافی جو تلخ زمینی حقائق جیسے کہ لاپتا افراد، ڈیتھ سکواڈ کے ہاتھوں یا دہشت گرد اور فرقہ ورانہ حملونمیں ہلاکتونکو بے نقاب کرتے ہیں انہیں دھمکایا اور قتل کردیا جاتا ہے۔ بلوچستان یونین آف جرنلسٹس کے مطابق، بلوچستان میں 2008سے اب تک کم از کم 24 صحافی ہدف بنا کر ہلاک کئے جا چکے ہیں جبکہ بلوچستان کے شورش زدہ حصوں میں اتنے ہی صحافی فائرنگ کی زد میں آکر، خود کش حملوں یا بم دھماکوں میں مارے جاچکے ہیں۔ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ان کے قاتل اب تک گرفتار نہیں ہوسکے۔

ارشاد مستوئی کا کیس

آن لائن ایجنسی کے بیورو چیف اور بلوچستان یونین آف جرنلسٹس کے سیکریٹری ارشاد مستوئی، رپورٹر عبدل رسول اور اکاؤنٹنٹ محمد یونس کو اگست 2014 میں کوئٹہ میں قتل کردیا گیا۔ ایک مسلح شخص ان کے دفتر میں داخل ہوا اور فائرنگ کردی جس سے تینوں افراد موقع پر ہلاک ہوگئے۔

اگرچہ ارشاد مستوئی کو کالعدم بلوچ قوم پرست تنظیموں اور اسلامی جنگجو گروہوں کی طرف سے جان سے مارنے کی دھمکیاں مل رہی تھیں تاہم انہوں نے ان کے قتل کی ذمہ داری قبول نہیں کی۔

چند ماہ بعد، پولیس نے قاتل کو گرفتار کرنے کا دعویٰ کیا جس نے ، پولیس کے مطابق، ارشاد مستوئی اور بلوچستان نیشنل پارٹی کے سابق سیکریٹری حبیب جالب کو قتل کرنے کا اعتراف کیا۔ بعدازاں، پولیس نے ملزم کو ایک پولیس مقابلے میں ہلاک کرنے کا دعویٰ کیا۔

مستوئی کے خاندان اور دوستوں نے پولیس کے دعووں کو مشکوک قرار دیا کیونکہ جالب کے قاتل پر مستوئی کی ہلاکت سے پہلے سے عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا۔

مستوئی کی ہلاکت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال بلوچستان میں صحافیوں کے لئے نظام انصاف کے تاریک پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہےجہاں تفتیش کار ہی مشکوک بن جاتے ہیں۔

بلوچستان سے کہیں دور وزیرستان میں، جو کبھی دہشت گردی کے خلاف جنگ کا گڑھ ہوا کرتا تھا، شدید خوف اور خود پرسنسرشپ کی یہی فضاء موجود ہے۔ صحافیوں کو نامعلوم افراد کی طرف سے دھمکی آمیز کالز موصول ہونا ایک عام بات ہے۔ مفاد عامہ کے اہم معاملات ، جیسے کہ منشیات کی سمگلنگ، آئی ڈی پیز کی بحالی یا سکولوں کی تعمیر نو پر رپورٹنگ مسائل پیدا کرسکتی ہے۔

"دہشت گردی کے خلاف جنگ کے بعد بارودی سرنگوں کا صفایا ایک ایسا معاملہ ہے جس پر کئی اہم سٹوریز لکھی جاسکتی ہیں۔ لیکن ایجنسیاں نہیں چاہتیں کہ انہیں رپورٹ کیا جائے۔ میں

> نے ایک خاتون کے بارے میں ایک رپورٹ لکھی جو ایک بارودی سرنگ پھٹنے سے اپنی دونوں ٹانگوں سے محروم ہوگئی تھی۔ آئی ایس پی آر نے اعتراض کیا کہ میں نے لکھا تھا کہ حادثہ ایک چیک پوسٹ کے قریب پیش آیا تھا۔ اس نے مجھے سٹوری ہٹانے پر مجبور کردیا۔"

خواتین صحافیوں کے لئے حالات اور بھی زیادہ مشکل ہیں۔ ڈیرہ اسماعیل سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون صحافی ، جو وزیرستان سے مسلسل رپورٹنگ کرتی ہیں، کو اکثر مقامی روایات کو پامال کرنے کا موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "وزیرستان میں خواتین کی تعلیم اور انسانی حقوق کے دیگر معاملات کی کوریج مشکل ہے چونکہ ایسا کرنے پر نامعلوم افراد کی جانب سے دھمکی آمیز کالز کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ یہ کالز نہ صرف حکومتی بلکہ سکیورٹی اہلکاروں کی طرف سے بھی موصول ہوتی ہیں۔"

خضدار، پنجگور، قلات اور نوشکی کے پریس کلبوں کو اس بے بنیاد الزام پر زبردستی بند کردیا گیا کہ ان کے اراکین ایف سی اور دیگر ایجنسیوں کے ایجنٹ ہیں۔ خضدار میں ایک کالعدم تنظیم نے صحافیوں کی ہٹ لسٹ جاری کرتے ہوئے الزام عائد کیا کہ وہ ریاستی عناصر کے لئے کام کررہے تھے۔

پشاور میں ہونے والی فوکس گروپ ڈِسکشن کے دوران شرکاء نے قبائلی علاقہ جات کے پریس کلبوں پر دباؤ پر بھی بات کی۔ حکومت پریس کانفرنسوں کو بھی کنٹرول کرتی ہے۔

سفارشات

- صحافیوں کے قتل کی ایف آئی آر درج کی جائیں اور مجرموں کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے
- مشکلات کا شکار میڈیا کے افراد کے لئے قانونی معاونت کا ایک آزادانہ اور مؤثر نظام قائم کیا جائے
- شورش زدہ علاقوں میں کام کرنے والے صحافیوں کی استعداد میں اضافے کے لئے پیشہ ورانہ تربیتی پروگراموں کا انعقاد کیا جائے
- شورش زدہ علاقوں میں کام کرنے والے صحافیوں کو حفاظت اور ابتدائی طبی امداد کی تربیت دی جائے۔ انہیں بُلیٹ پروف جیکٹیں اور میڈیکل کِٹس دی جائیں
- میڈیا کے افراد کو لائف انشورنس مہیا کی جائے
- ریاست اور میڈیا ہاؤسز متاثرہ خاندانوں کو مناسب معاوضہ ادا کریں
- اس پیشے کو اختیار کرنے میں خواتین کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ صنفی برابری کو برقرار رکھا جاسکے
- میڈیا کے اداروں کو شورش زدہ علاقوں میں ایک پیشہ ورانہ ملازمتی ڈھانچہ تشکیل دینا چاہئے
- میڈیا ہاؤسز کو اپنے عملے کو ریاستی اور غیر ریاستی ایجنسیوں کی دھمکیوں سے تحفظ فراہم کرنا چاہئے

میڈیا میں خواتین: ہراسگی، کام کے حالات اور مواقع

کام کی جگہ پر ہراسگی اور لوگوں کی تشدد کی اس قسم سے واقفیت پر ایک مفصل بحث، خاص طور پر اس تناظر میں کہ خواتین کو اس کا کتنا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس کے بارے میں ان کی رائے کیا ہے، سے یہ بات سامنے آئی کہ یہ مسئلہ انتہائی غیر اہم سمجھا جاتا ہے۔ یہ بات خواتین کی صحافت میں موجودگی کو پُر خطر بنادیتی ہے۔

> "میں ایک پراعتماد اور بے باک عورت نہیں تھی۔ جب مجھے ہراساں کیا جارہا تھا تو میں نے خود کو بے یارو مددگار محسوس کیا۔ میرے سینیئر مرد رفقاء نے ایک بار مجھ سے کہا، 'جب میں بیگمات جیسا لباس پہنتی ہوں تو میں خوبصورت لگتی ہوں'۔ اس بات نے مجھے پریشان کردیا۔"

اگرچہ 'کام کی جگہ پر خواتین کو ہراسگی سے تحفظ فراہم کرنے کا ایکٹ 2010 سے نافذ العمل ہے، بہت کم لوگ اس سے واقف ہیں۔ یہ قانون کام کی جگہوں پر جنسی ہراسگی سے متعلق تحقیقاتی کمیٹیوں کے قیام کو

لازمی قرار دیتا ہے ۔ تاہم، کمیٹی کے امتزاج کے بارے میں شدید ابہام پایا جاتا ہے ۔ حتیٰ کہ نیوز رومز کا انتظام چلانے والے میڈیا کے سینیئر افراد بھی اسے اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔

> "سماء ٹی وی کے لئے رپورٹنگ کے دوران میری نواب شاہ یونیورسٹی کی ایک طالبہ سےملاقات ہوئی جس کا دعویٰ تھا کہ پروفیسر تحقیقاتی کمیٹی کے افراد کو ہراساں کررہے تھے جو تین مردوں پر مشتمل تھی۔ میری نیوز ایڈیٹر جو اتفاقاً ایک خاتون تھیں، نے سٹوری کے خیال کو رد کردیا۔انہوں نے کہا 'اس میں خبر کیا ہے؟ کمیٹی بن چکی ہے اور تحقیقات جاری ہیں۔' میں نے واقعے کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی جن میں سے ایک یہ تھا کہ کمیٹی میں ایک بھی خاتون شامل نہیں۔ -- کافی کوششوں کے بعد میری سٹوری شائع ہوگئی۔"

پس، میڈیا ہاؤسز میں تحقیقاتی کمیٹیاں موجود ہوں تو بھی وہ غیر مؤثر ہوتی ہیں ؛ چاہے یہ کمیٹیاں قابل افراد پر مشتمل ہی کیوں نہ ہوں، یہ افراد اتنے تربیت یافتہ نہیں ہوتے کہ وہ جرم کا تعین کرسکیں اور مجرم کو قصوروار ٹھہرا سکیں۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اداروں میں کمیٹی قائم نہ کرنے والوں کے لئے قانون میں کوئی جرمانہ مقرر نہیں کیا گیا۔

تحقیقاتی کمیٹیوں کی نامعقولیت ایک طرف، متاثرہ خاتون کے لئے اپنے سے زیادہ طاقت ور مرد ساتھی کے خلاف بولناانتہائی مشکل ہوتا ہے۔ متاثرہ خواتین غیر محفوظ، اپنا کیریئر تباہ ہونے یا حتیٰ کہ اپنی ملازمت کھو دینے کے خوف میں مبتلا ہوتی ہیں۔ شازو نادر اور بہادر خواتین جو اپنے آجروں یا سینیئرساتھیوں کو جنسی ہراسانی کے بارے میں بتانے کی جرآت کرتی ہیں انہیں ایک 'بے ضرر' یا 'عام' سی بات پر دوسروں پر انگلی اٹھانے پر تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

> "میں نے اپنی دو ساتھی خواتین کے کیس کی نشاندہی کی جنہیں ان کے شعبہ کے سربراہ واٹس ایپ گروپ میں ہراساں کررہے تھے۔ اس کے نتیجے میں، مجھے فوری طور پر ملازمت سے فارغ کردیا گیا اور میری دو ساتھی خواتین کو بھی مستعفی ہونے پر مجبور کیا گیا۔"

میڈیا میں لڑکیوں اور خواتین سے متعلق دقیانوسی خیالات کا تعلق اس بات سے ہے کہ خواتین کون ہیں اور معاشرے میں ان کا کیا کردار ہونا چاہئے۔ یہ دقیانوسی خیالات منفی، محدود کُن، توہین آمیز ہوسکتے ہیں اور ان کا نہ صرف اس بات پر اثر پڑتا ہے کہ خواتین اپنے بارے میں کیا محسوس کرتی ہیں بلکہ اس بات پر بھی کہ دوسرے انہیں کس طرح سے دیکھتے ہیں۔ عکس کی ایک حالیہ تحقیق کے مطابق 72 ٹی وی کمرشل میں خواتین کی جنسی تجسیم کی گئی تھی جبکہ 26 کمرشل غیر دقیانوسی تھیں۔ چنانچہ، یہ بات حیران کن نہیں کہ خواتین کے خلاف تعصب پر مبنی یہ حکمت عملی ان ناظرین کے ذہنوں پر اثرانداز ہوتی ہے جو نہ صرف ان صنفی تصورات کو قبول کرتے ہیں بلکہ انہیں اپنی نجی زندگیوں پر اثرانداز ہونے کی بھی اجازت دیتے ہیں۔

سفارشات

- میڈیا ہاؤسز کے شعبہ انسانی تعلقات کو ادارے کے اندر جنسی ہراسگی کے بارے میں آگہی پیدا کرنی چاہئے۔
- ملازمین کو قانون میں دیے گئے ضوابط کے بارے میں آگاہ کیا جائے اور انہیں دفاتر میں واضح طور پر آویزاں کیا جائے۔
- ہر ادارے میں خواتین کی ہراسگی سے متعلق کمیٹیاں تشکیل دی جائیں جو مؤثر اور بااختیار ہوں۔
- تحقیقاتی کمیٹی کے اراکین سے سب واقف ہوں اور وہ باآسانی قابل رسائی ہوں۔
- نیوز رومز میں ایک سازگار دفتری ماحول قائم کیا جائے جہاں متاثرین انتقامی کارروائی کے خوف کے بغیر خلاف ورزیوں کی اطلاع دے سکیں۔
- صحافیوں کو خواتین سے متعلق رپورٹس اور خبریں باقاعدگی سے تیار کرنی چاہئیں تاکہ موضوع کو زندہ رکھا جاسکے۔
- بچوں کو جنسی ہراسگی کے حوالے سے باشعور بنانے کے لئے اس موضوع کو سکولوں کے نصاب کا حصہ بنایا جائے۔
- انٹرٹینمنٹ ٹی وی اور ڈراموں میں خواتین کی تصویر کشی حقیقت پسندانہ ہونی چاہئے۔

دیگر اقسام کے میڈیا کے دور میں پرنٹ میڈیا کا مستقبل: ملازمتی عدم تحفظ اور دیگر مسائل

یہ امر حیران کن نہیں کہ زیادہ تر شرکاء ملازمت کے حوالے سے عدم تحفظ کا شکار ہیں اور وہ تنخواہوں میں تاخیر اور کٹوتی کی وجہ سے خود کو لاچار محسوس کررہے ہیں۔ مستقبل میں غیرضروری ہوجانے کا ڈر انہیں انتہائی کم، حتیٰ کہ 40 فیصد تک کم تنخواہوں پر کام کرنے یا تنخواہوں میں تاخیر، جو تین ماہ تک ہوسکتی ہے، کو قبول کرنے پر مجبور کررہا ہے۔ انہیں مزید مالی دباؤ کا اس وقت سامنا کرنا پڑتا ہے جب ان کے آجر مفادات کے ٹکراؤ کے پیش نظر انہیں دیگر پلیٹ فارمز جیسے کہ نشریاتی چینل یا ڈیجیٹل میڈیا ویب سائٹس کی کھوج لگانے کی اجازت نہیں دیتے۔

میڈیا ہاؤسز کے مالکان معاہدہِ ملازمت، جس پر صحافیوں کو بھرتی کے وقت دستخط کرنا ہوتے ہیں، میں موجود شقوں کو رائے کے آزادانہ اظہار کو کنٹرول کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ بعض میڈیاہاؤس کے معاہدہ ملازمت میں واضح کیا گیا ہوتا ہے کہ ملازمین اپنا سوشل یا ڈیجیٹل میڈیا شروع نہیں کرسکتے۔ انہیں بعض اوقات کام کے اوقات کے دوران سوشل میڈیا پر ایکٹیو ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی اور ان پر غیر دفتری اوقات کے دوران بھی نظررکھی جاتی ہے۔ وہ ٹویٹر یا فیس بک پر پوسٹ نہیں کرسکتے کیونکہ ان کا کوئی ہم پیشہ ساتھی اس پوسٹ کا سکرین شاٹ لے کر سینیئر مینجمنٹ کو بھیج سکتا ہے۔ "ہمیں سوشل میڈیا پر محض ایک قابل اعتراض تبصرے پر ملازمت سے فارغ کیا جاسکتا ہے۔" یہ بات انہیں عوامی بحث میں آزادانہ طور پر حصہ لینے سے روکتی ہے۔

لیکن، ایف جی ڈی میں حصہ لینے والے صحافیوں نے شکایت کی کہ ادارے اپنے منظورِ نظر عملے کے لئے ضوابط کے حوالے سے لچک کا مظاہرہ کرکے دوسروں کے ساتھ امتیاز برت سکتے ہیں۔

خیبرپختونخوا میں میڈیا کے افراد کا بھی یہی تجربہ رہا ہے۔

> "ایک ذاتی ٹویٹ کی بناء پر میرے ادارے نے آئی ایس پی آر کے احکامات پر مجھے نوکری سے فارغ کردیا۔ جب ایجنسیاں اور مالکان دونوں ہی صحافی کا تحفظ نہ کریں تو ایسی صورت میں اسے کیا کرنا چاہئے؟"

بلوچستان میں میڈیا کے افراد تنخواہ اور ملازمت میں کٹوتی کو مقامی پریس کی مزید زبان بندی کی ایک کوشش قرار دیتے ہیں۔ مرکزی میڈیا ہاؤسز کے نیوز بیورو یا تو بند ہوچکے ہیں یا پھر انہوں نے اپنے عملے میں کمی کردی ہے۔ ایک واحد رپورٹر جو تمام خبریں کور کرتا ہے زیادہ تر وہی انہیں چلاتا ہے۔ ان کی یہ بھی شکایت ہے کہ اسلام آباد ، کراچی یا لاہور میں شو چلانے والے میڈیا کے افراد ان بلوچ صحافیوں کو درپیش خطرات کو صحیح طرح نہیں سمجھتے جو نمائندوں کے طور پر کام کرتے ہیں صوبے کے دور افتادہ علاقوں سے رپورٹنگ کرتے ہیں۔

> "چونکہ ہم کُل وقتی ملازم نہیں ہوتے اس لئے وہ ہماری سلامتی میں بہت کم دلچسپی لیتے ہیں۔"

علاوہ ازیں، ریاستی اداروں اور حکمران جماعت کے میڈیا سیل مل کر صحافیوں کو فوٹوشاپ کی گئیں تصاویر کے ذریعے نشانہ بناتے ہیں اور ان کے خلاف باقاعدگی سے ٹرینڈ چلاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کو ریاستی اداروں اور مالکان نے اپنے ٹویٹر اکاؤنٹ حذف کرنے کو کہا۔

سفارشات

- نیوز روم ہر قسم کے دباؤ سے آزاد ہونے چاہئیں اور فیصلے پیشہ ور ایڈیٹروں کو کرنے چاہئیں
- تنخواہیں وقت پر ادا کی جائیں
- تنخواہوں میں کٹوتی کو روکا جائے
- میڈیا کے افراد کے خلاف سوشل میڈیا مہمات روکی جائیں
- حکومت کو صحافیوں کے خلاف ناجائز کارروائیوں میں ملوث اکاؤنٹس کا پتا لگانا چاہئے
- اسلام آباد سے تعلق رکھنے والے ٹرائبیونل کا دائرہ کار ضلعی سطح تک وسیع کیا جائے تاکہ تنخواہوں اور دیگر واجبات کی باقاعدگی سے ادائیگی کو یقینی بنایا جاسکے

- پرنٹ میڈیا کو وقت سے ہم آہنگ ہونے کے لئے نئی اختراعات اپنانا ہوں گی اور شاید پے وال کا حامل ڈیجیٹل ماڈل اپنانا ہوگا

مرکزی میڈیا میں خواتین اور اقلیتوں کے تناظر میں پاکستان کے دیہی علاقوں کی نمائندگی

ایک ورچوئل اجلاس میں میڈیا کے افراد نے جنوبی پنجاب میں میڈیا میں خواتین اور مذہبی اقلیتوں کی نمائندگی پر مفصل بحث کی۔ انہوں نے اس بات کی نشاندہی کی کہ پاکستان میں میڈیا کی صنعت زوال کا شکار ہے جس کا دیہی علاقوں میں سب سے زیادہ نشانہ خواتین صحافی بنتی ہیں۔

علاوہ ازیں، جنس کی بنیاد پر خواتین کی ہراسگی عام ہے جس کے باعث بہت سی خواتین ملازمت چھوڑ دیتی ہیں۔ نیوز رومز میں خواتین کی کم نمائندگی کے باعث خواتین سے متعلقہ اہم مسائل رپورٹ نہیں ہوپاتے۔

خواتین کی طرح، جنوبی پنجاب کے میڈیا ہاؤسز میں مذہبی اقلیتوں کی نمائندگی بھی بہت کم ہے۔ انہیں اچھوت سمجھا جاتا ہے، ان کے ساتھی ان کے ساتھ کھاتے پیتے نہیں۔ انہیں صفائی اور دھلائی جیسی معمولی ملازمتیں دی جاتی ہیں اور وہ خوش قسمت افراد جو قابل عزت ملازمت حاصل کر بھی لیں انہیں کم معاوضہ دیا جاتا ہے۔

خیبر پختونخوا میں مذہبی انتہا پسندوں کی جانب سے دھمکیاں صحافیوں مذہبی آزادی اور حقوق کی خلاف ورزیوں پر رپورٹنگ سے روکتی ہیں۔ اگر کوئی شازو نادر خبر رپورٹ ہو بھی جائے تو یا تو اسے محدود کردیا جاتا ہے یا پھر اس کی شکل ہی بگاڑ دی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر پشاور کی ایک عدالت میں ایک شیعہ شخص کی ہلاکت پر ایک اخبار نے رپورٹ کیا :'غازی خالد نے مرتد ظاہر نسیم کو جہنم بھیج دیا'۔

سفارشات

- خبررساں اداروں کو نیوزرومز میں تنوع لانے کے لئے خواتین اور اقلیتی برادریوں کے افراد کو بھرتی کرنا چاہئے
- انہیں مساوی تنخواہیں دی جائیں
- پرنٹ اور نشریاتی میڈیا میں خواتین اور اقلیتوں سے متعلق رپورٹس باقاعدگی سے چلائی جائیں تاکہ ان کے مقصد کے بارے میں آگہی پیدا کی جاسکے